سامراج کی حقیقت: از جاوید اکبر انصاری رحمۃ اللہ علیہ

مصنف کی اپنی زبان میں ایک تعارف

یہ کتاب میں نے کیوں لکھی؟

ادریس اسماعیل، امین اشعر

آج تقریباً پورا عالمِ اسلام، اور بالخصوص پاکستان، سامراج کی گرفت میں ہے۔ پاکستان ایک نیو کالونی ہے، ہماری ریاست عملاً ایک باجگزار ریاست بن چکی ہے، اور حقیقی آزادی ایک بے معنی تصور ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم سب سامراج کے اسیر ہیں، لیکن اس اسیری کا شعور عام نہیں۔ یہ کتاب اسی شعور کی فراہمی کی ایک کوشش ہے، کیونکہ سامراجی نظام کو سمجھے بغیر ہم اس سے نجات کی کوئی مؤثر حکمتِ عملی مرتب نہیں کر سکتے۔

میرے مخاطب مسلمان قارئین ہیں، بالخصوص علمائے کرام اور مدارس کے طلبہ۔ ردِ سامراجیت کی جدوجہد کی قیادت آخر کار انہی کو کرنی ہے، اور وہ یہ قیادت سرمایہ دارانہ نظام کو سمجھے بغیر نہیں کر سکتے۔

سامراج اصل میں ہے کیا

سامراج محض غیر ملکی فوجی قبضہ یا نو آبادیاتی حکمرانی نہیں۔ سامراج ایک نظام ہے، اور نظام اس کلیت کو کہتے ہیں جس کے اعضاء ایک مخصوص مقصدِ وجود کے حصول کے لیے مربوط ہوتے ہیں۔ سامراج سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کی وہ مخصوص عالمی تنظیم ہے جس کا واحد مقصدِ وجود بڑھوتریٔ سرمایہ برائے بڑھوتریٔ سرمایہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اپنے اسی مقصد کی جستجو میں تین چیزیں تخلیق کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ انفرادیت، یعنی ہیومن بینگ، ایک ایسی انفرادیت جو خود اختیاریت اور خود تخلیقیت کا دعویٰ کرتی ہے اور اپنے نفسِ امارہ کی بنیاد پر آفاقی قانون سازی کو جائز سمجھتی ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرت، یعنی سول سوسائٹی، جس کا مرکزی ادارہ مارکیٹ ہے، جہاں ہیومن بینگ اپنی

خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے سے معاہداتی روابط استوار کرتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ ریاست، یعنی ریپبلک، جہاں ہیومن بینگ اجتماعی رضامندی سے تحکمِ قانونِ سرمایہ جاری رکھتے ہیں۔

سامراج اسی سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو عالمگیر بنانے کی جدوجہد ہے؛ یعنی غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو دنیا سے بے دخل کرنے یا انہیں سرمایہ دارانہ تغلب کے ماتحت کرنے کی جدوجہد۔ یہی وہ چیز ہے جس کے خلاف ہم حقیقتاً برسرِپیکار ہیں۔

وہ تاریخ جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں

سامراج وہ قدیم استعماری نظام نہیں جو یونانیوں اور رومیوں نے قائم کیا تھا۔ یہ دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ اس کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی، جب اسپین، پرتگال، فرانس اور برطانیہ نے امریکا پر قبضہ کیا اور کروڑوں مقامی باشندوں کو قتل کرکے ان کی املاک چھین لیں۔ اٹھارہویں صدی سے ہندوستان اور چین، اور انیسویں صدی میں امریکا اور افریقہ پر سامراجی تسلط قائم کیا گیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کا سامراجی بٹوارہ ہوا اور مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر علاقے فرانس اور برطانیہ کے زیرِ تسلط آ گئے، جبکہ سعودی عرب، مصر، ایران اور افغانستان جیسی سامراج کی باجگزار "آزاد" ریاستیں قائم ہوئیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سامراجی ممالک اپنے مفتوحہ علاقوں سے اصولاً دستبردار ہوئے، لیکن تقریباً ہر جگہ ایسی باجگزار ریاستیں قائم کر دی گئیں جن میں سرمایہ دارانہ نظریات کی پیروکار اشرافیہ برسرِاقتدار آئی۔

اس انخلاء کا یہ عمل صرف مغربی ممالک تک محدود رہا۔ چین اور سوویت یونین کبھی اپنی سامراجی مفتوحات سے دستبردار نہ ہوئے۔ چین آج تک مشرقی ترکستان اور تبت پر قابض ہے، اور روس داغستان، چیچنیا اور دیگر مسلم علاقوں پر قابض ہے۔ سرمایہ داری سولھویں صدی سے آج تک کسی نہ کسی شکل میں سامراجی ہی رہی ہے؛ صرف اس کی اداراتی صورت

اور حکمران نظریہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔

آج کے تین سامراجی مراکز

آج عالمی سامراجی نظام کے تین مرکزی ممالک ہیں: امریکا، چین اور روس۔ امریکا اب بھی غالب سامراجی قوت ہے۔ اس نے پوری دنیا کو اپنے فوجی اڈوں میں گھیر لیا ہے جن کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، ڈبلیو آئی پی او، ایف اے ٹی ایف، نیٹو، ورلڈ بینک وغیرہ، یہ سب امریکی سامراجی تسلط کے آلہ کار ہیں، اور ان کے پیچھے میڈیا، تفریحی صنعت، ٹیکنالوجی اور این جی او نیٹ ورک کی شکل میں امریکی سافٹ پاور (قوت ناعمہ) کھڑی ہے۔

چین ایک ابھرتی ہوئی سامراجی قوت ہے، جس کے عزائم کی رومانوی تعبیر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ بات میں بالخصوص پاکستانی قارئین سے کہنا چاہتا ہوں جو چین کو دوست تصور کرتے ہیں۔ چین آج بھی مشرقی ترکستان اور تبت پر قابض ہے، مسلم آبادیوں کو دباتا ہے، اور اس کا بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ اسی کے اپنے سامراجی مفادات کی خدمت کرتا ہے۔ چین سامراج کا متبادل نہیں، سامراجی نظام کے اندر اس کی قیادت کا ایک حریف ہے۔

روس ایک زوال پذیر سامراجی قوت ہے جو یوکرین میں اپنے دائرہ اثر کا دفاع کر رہی ہے۔ چین کی طرح روس نے بھی اپنی مفتوحہ مسلم سرزمینوں کو کبھی آزاد نہیں کیا۔

آج کے سامراجی نظام کی پانچ خصوصیات

دورِ حاضر کے سامراجی نظام کی پانچ خصوصیات ہیں۔ پہلی، چند اجارہ دار کمپنیاں عالمی پیداوار اور تجارت پر چھائی ہوئی ہیں اور ان کی دولت کئی ممالک کی مجموعی دولت سے زیادہ ہے۔ دوسری، فائنانس فیصلہ کن قوت بن چکا ہے، ڈالر کی بالادستی اور آئی ٹی اجارہ داریوں نے ایک ایسا عالمی فائنانشل ڈھانچہ کھڑا کر دیا ہے جو غریب دنیا سے دولت کھینچ کر سامراجی مراکز میں جمع کرتا ہے۔ تیسری، یہ معاشی نظام ایک ایسے بین الاقوامی سیاسی اتحاد کی پشت پناہی میں چلتا

ہے جس کا سرخیل امریکا ہے اور جس میں چین سمیت کئی اور ممالک شامل ہیں، اور جو سرمایہ دارانہ تحکم کے قواعد وضع کرتا ہے۔ چوتھی، یہ نظام بار بار فائنانشل، ماحولیاتی، سیاسی اور سماجی بحرانوں کا شکار ہوتا ہے، لیکن اس کے منتظمین وقتی طور پر ان بحرانوں کو سنبھال کر نظام کے مکمل انہدام سے بچالیتے ہیں۔ پانچویں، اس نظام کی موجودہ مخصوص صورت نے ۱۹۸۰ کی دہائی میں جنم لیا اور یہ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد مستحکم ہوئی؛ اس کی نظریاتی بنیاد نیولبرلزم ہے۔

پاکستان: ایک آئینہ جس میں ہمیں جھانکنا ہے

اپنے ملک کے بارے میں واضح بات کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ جس چیز کو ہم دیکھنے سے انکار کرتے ہیں اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان برطانوی سامراج سے کیے گئے ایک معاہدے کے نتیجے میں قائم ہوا، جس کی پشت پر مسلم قوم پرستی کی سرمایہ دارانہ نظریاتی تحریک تھی۔ اپنے ابتدائی ایام ہی سے پاکستانی ریاست سامراج سے مقروض ہونے کی خواہش کا اظہار کر بیٹھی۔ دسمبر ۱۹۴۷ میں جناح صاحب نے امریکا سے قرضہ طلب کیا۔ ۱۹۵۸ میں ایوب خان کی حکومت نے پہلی مرتبہ آئی ایم ایف سے رجوع کیا، اور آج تک ہم آئی ایم ایف سے چوبیس معاہدے کر چکے ہیں، اور اب اپنی تاریخ کا سب سے بڑا قرضہ جاتی معاہدہ کرنے کی جستجو میں ہیں۔ جبکہ ہم اپنا سالانہ بجٹ تک آزادانہ طور پر نہیں بناسکتے۔

ہماری پوری معیشت سامراج کی گرفت میں ہے۔ ہم قومی اثاثے کوڑیوں کے دام پر سامراجی سرمایہ کاروں کو فروخت کر رہے ہیں۔ ہماری سودی ادائیگیاں ہمارے ٹیکس محصولات کو نگل رہی ہیں، جبکہ ہماری ریاستی اشرافیہ اربوں ڈالر سامراجی فائنانشل مارکیٹوں میں لگائے بیٹھی ہے۔

ہماری خارجہ پالیسی بھی یہی کہانی دہراتی ہے۔ ۱۹۵۰ میں لیاقت علی خان کے امریکا کے دورے نے ہماری ماتحتی کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۹۵۰ کی دہائی میں ہم سیٹو اور سینٹو کے رکن بنے۔

۱۹۷۱ میں سامراج نے ہمارا ملک دو لخت کر دیا۔ ۲۰۰۱ کے بعد ہم امریکی دہشت گردی مہمات کا آلہ کار بن گئے اور مجاہدین کو پکڑ پکڑ کر سامراج کے حوالے کیا۔ ہم آج تک کشمیر کو چھڑا نہیں سکے، اور مشرقی ترکستان میں چینی مظالم کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ہماری خارجہ پالیسی کا واحد مقصد اپنے دونوں سامراجی آقاؤں، امریکا اور چین، کو بیک وقت خوش رکھنا ہے۔

فائنانشل جنگ کیسے لڑی جاتی ہے

میں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین، بالخصوص علماء، یہ بات سمجھیں کہ امریکا اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے صرف فوجی قوت استعمال نہیں کرتا۔ وہ فائنانس کو بھی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ستر فیصد غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر ڈالر میں رکھے جاتے ہیں، ساٹھ فیصد سے زیادہ بین الاقوامی تجارت ڈالر میں ہوتی ہے، اور نوے فیصد بینکنگ کاروبار ڈالروں میں ہوتا ہے۔ اس بالادستی کی بدولت امریکی مرکزی بینک، فیڈرل ریزرو، عملاً دنیا کا مرکزی بینک بن چکا ہے، اور امریکی وزارتِ خزانہ کی پابندیاں دنیا کے ہر بینک پر نافذ ہوتی ہیں۔ امریکا نے افغانستان، ایران، شمالی کوریا اور وینزویلا پر پابندیاں عائد کر کے ان کے غیر ملکی اثاثوں پر قبضہ جما لیا ہے، اور روس کو سوئفٹ نظام سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ سفارت کاری نہیں۔ یہ فائنانشل جنگ ہے، اور بغیر کوئی گولی چلائے سامراجی تسلط برقرار رکھنے کا ایک بنیادی ذریعہ ہے۔

نظریاتی ہتھیار: نیولبرلزم

نیولبرلزم کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ ریاست فائنانشل اور محنت کی مارکیٹوں پر سے تمام قانونی پابندیاں اٹھا لے۔ آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ڈبلیو ٹی او اور ڈبلیو آئی پی او اسی نظریہ کے عالمی نفاذ کے ذمہ دار ہیں اور ایک غیر موجود عالمی سرمایہ دارانہ ریاست کا متبادل کردار ادا کرتے

ہیں۔

نیولبرلزم جو پیدا کرتا ہے وہ خوشحالی نہیں، کرایہ خوری اور حرام خوری پر مبنی ایک معیشت ہے۔ یہ ایک ایسی معیشت ہے جہاں منافع پیداوار سے نہیں، ملکیت اور کرایہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پیٹنٹس، فائنانشل آلات، زمین وغیرہ سب کچھ استحصال کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ پیداواری معیشت سکڑتی جاتی ہے جبکہ فائنانشل شعبہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ نظام وقتاً فوقتاً منہدم ہو جاتا ہے، جس کے بعد انہی فائنانشل اجارہ داروں کو ریاستی بیل آوٹ دے کر بچایا جاتا ہے جنہیں نیولبرلزم نے غیر ضروری قرار دیا تھا۔

ہیومن رائٹس کا نظریہ نیولبرلزم کا خارجی فتح کا ہتھیار ہے۔ ہر انسان کو ہیومن بینگ یعنی ایک سرمایہ دارانہ فرد بننا چاہیے۔ جو ریاستیں اس تبدیلی کو نافذ کرنے میں ناکام رہیں انہیں ہیومینیٹیرین مداخلت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے سامراج اپنی جنگوں کا جواز فراہم کرتا ہے۔

میں امریکی حکمتِ عملی کو کیسے پڑھتا ہوں

اپنا طریقہ کار واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے امریکی حکمتِ عملی کے بارے میں تبصروں پر انحصار نہیں کیا، بلکہ خود امریکی منصوبہ سازوں کی دستاویزات مثلاً، کونسل آن فارن ریلیشنز (سی ایف آر) کی رپورٹیں، اور خود امریکی ایوانِ صدر کی دستاویزات وغیرہ تک رسائی حاصل کی ہے۔ سامراج کے منصوبہ ساز آپس میں اپنے ارادے بڑی صراحت سے بیان کرتے ہیں۔

سی ایف آر کی ایک دستاویز کے مطابق امریکی عالمی تغلب کو برقرار رکھنے کے لیے چین کو زیرِ دست کرنا لازمی ہے، اور تعاون کی بجائے مسابقت پر انحصار کرنا چاہیے۔ ایک اور دستاویز، "چین کے خلاف عظیم حکمت عملی"(Grand Strategy for China)چین کے خلاف ایک "مخلوط جنگ"(Hybrid War) کی وکالت کرتی ہے۔ ایسی جنگ جس میں ماحولیات جیسے مشترکہ مسائل پر تعاون بھی جاری رہے اور ساتھ ساتھ چینی قوت کو محدود

بھی کیا جاتا رہے۔ اس کے سات نکات میں ایشیا میں چینی اتحاد روکنا، چین کے خلاف معاشی جنگ تیز کرنا، بحرالکاہل میں سمندری ناکہ بندی، تائیوان کی خود مختاری کا تحفظ، اور یہ شرط شامل ہے کہ ماحولیاتی مشاورت صرف اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب چین کو مغربی قوت سے مرعوب کر لیا جائے۔ کرٹ کیمبل اور جیک سلیوان کا ۲۰۱۹ کا تجزیہ، Competition Without Catastrophe، اسی مقابلے کو ٹھنڈی جنگ میں تبدیل ہونے سے بچانے کی بات کرتا ہے، لیکن وہ بھی بالآخر سفارتی اور تزویراتی تصادم کو ناگزیر سمجھتا ہے۔

سی ایف آر کا اصل مقصد امریکی عالمی تغلب کا تحفظ ہے، کیونکہ کوئی عالمی سرمایہ دارانہ ریاست قائم نہیں کی جا سکتی اور امریکی ریاست ہی اس کا نعم البدل فراہم کرتی ہے، اس لیے امریکی ریاست کا غلبہ عالمی سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے لازمی ہے۔ سرمایہ داری جنگ کی پیداوار ہے اور بغیر جنگ جاری رکھے قائم نہیں رہ سکتی، خواہ یہ جنگ سرد ہو، مخلوط ہو، یا گرم۔

جنگ کے بارے میں

جنگ سامراج کا فیصلہ کن ہتھیار ہے۔ بڑی نیوکلیئر قوتوں کے درمیان براہِ راست جنگ تقریباً ناممکن ہے، کیونکہ باہمی تباہی کا خطرہ اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام، جس پر سب کا انحصار ہے، کا ممکنہ خاتمہ اس کا نتیجہ ہو گا۔ یہ سب نیوکلیئر جنگ کو غیر معقول بنا دیتا ہے۔ اس کی جگہ پراکسی جنگیں لڑی جاتی ہیں، جن کی واضح ترین مثال یوکرین ہے، جہاں امریکا، ایک امریکی فوجی کو بھی میدانِ جنگ میں اتارے بغیر روس سے برسرِپیکار ہے۔ اس کے علاوہ، سامراجی طاقتیں، پرانے طرز کی نوآبادیاتی جنگیں مسلط کرتے ہوئے، کچھ ممالک پر براہِ راست بھی حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔

نیٹو مغربی سامراجی جنگ کا تنظیمی آلہ ہے۔ اس کا مقصد صرف روس اور چین کو روکنا نہیں، بلکہ کسی آزاد یورپی سلامتی کے انتظام کو ابھرنے سے روکنا بھی اس کے مقاصد میں سے ہے۔ جرمنی اور فرانس کو امریکا کی ماتحتی میں رکھنا بھی نیٹو کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

دو حریف سرمایہ داریاں: نیولبرلزم اور پوسٹ فاشزم

نیولبرلزم کو آج کئی ممالک میں ایک متبادل نظریاتی بنیاد، پوسٹ فاشزم، کے ذریعے چیلنج کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریک لبرل پالیسیوں کو جزواً قبول کرتی ہے، لیکن اس کا اساسی نظریہ قوم پرستی ہے۔ یہ ریاستی سرمایہ داری نہیں بلکہ نجی سرمایہ دارانہ تفوق کی تائید کرتی ہے لیکن اسے قومی خطوط پر منظم کرنے کی بات کرتی ہے۔

یہ بظاہر اشرافیہ مخالف تحریک ہے، تقسیمی نامساویت کے خلاف عوام کو متحرک کرتی ہے، لیکن اس کی پہچان اسلام دشمنی ہے۔ یہ اسلامی دعوت کے پھیلاؤ اور مسلم تارکینِ وطن کو یورپی تہذیب کے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ یہ عالمگیریت کی مخالف نہیں، صرف بے لگام عالمگیریت کی مخالف ہے، اور امریکی عالمی تسلط کی بھرپور حامی رہتی ہے، گو کہ ایسی جنگوں سے گریز کرتی ہے جن میں شکست یقینی نظر آئے۔ بیسویں صدی کے اس کے دو اہم مفکر یولیئس ایوولا اور الیگزینڈر ڈوگن، پوسٹ فاشسٹ ریاست کو چھوٹے کاروباریوں، بے روزگاروں اور حرام خور اجارہ داروں کے درمیان ایک طبقاتی اتحاد تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ عملاً حرام خور اجارہ داروں کے مفادات کو ہی زیادہ فروغ ملتا ہے۔ یہ طبقاتی کشمکش دبانے کے لیے پوسٹ فاشسٹ سرکاریں نسل پرستی کا سہارا لیتی ہیں، اور امریکا و یورپ میں یہ نسل پرستی سب سے زیادہ اسلام دشمنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختصراً: پوسٹ فاشزم سرمایہ داری کے اندر ایک اختلاف ہے، عالمگیر اور قومی دھڑوں کا جھگڑا ہے، سرمایہ داری کو کوئی چیلنج نہیں۔

نیا مزدور: ڈیجیٹل اجارہ داری اور گِگ اکانومی

ڈیجیٹل اجارہ داریاں ہر ملک میں چھوٹے کاروباروں، بالخصوص حلال روزی کمانے والوں کو بے دخل کر رہی ہیں، اور سٹے بازار کے ذریعے سرکاری کمپنیوں کے حصص خرید کر قومی اثاثوں کو اپنے انتظامی نظام کے ماتحت کرتی جا رہی ہیں۔

ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے ایک نئی قسم کا کارکن پیدا کیا ہے۔ وہ کارکن جو اپنے گھر کے اندر بیٹھ کر سرمائے کی خدمت کرتا ہے۔ ڈیجیٹل کارپوریشنیں اس کے کام کو اجزاء میں تقسیم کرتی ہیں، اور آن لائن پلیٹ فارمز پورے کام کا انتظام سنبھالتے ہیں۔ کارکن کو ہر وقت آن لائن رہنا پڑتا ہے، اس کا ہر عمل کمپنی کو اطلاعات فراہم کرتا رہتا ہے، اور وہ یہ تک نہیں جان سکتا کہ کون اس کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام میں غلامی کی بدترین صورت ہے۔ امریکا میں فائنانس کے شعبہ میں اوقاتِ کار ساٹھ گھنٹے فی ہفتہ ہو چکے ہیں، اور دنیا بھر میں جز وقتی اور عارضی ملازمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں جن میں اجرتیں مستقل ملازمتوں کے مقابلے میں آدھی سے بھی کم ہیں۔

صرف اسلامی انقلاب ہی کیوں کامیاب ہو سکتا ہے

اب میں وہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں جو میرے تجزیہ کو سیکولر سامراج مخالف روایات سے ممتاز کرتی ہے، اور اس کے لیے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آج فی الواقع سامراج کے مخالف کون کون سے گروہ ہیں۔ آج سامراج مخالفین کی چار قسمیں ہیں۔

اول، چند لاطینی امریکی ممالک (کیوبا، وینزویلا، ہونڈوراس) ہیں جن کی سامراج مخالفت انیسویں صدی سے جاری ہے۔ حالیہ دور میں اس کا محرک قوم پرستی اور اشتراکیت رہا ہے۔ کاسترو اور شاویز جیسے قائدین نے واقعی خود کفیل معیشتیں قائم کرنے کی کوشش کی، اور جب برآمداتی قیمتیں عروج پر تھیں تو ان کی فلاحی پالیسیوں کو عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ قوم پرستی اور اشتراکیت خود سرمایہ دارانہ نظریات ہیں، یہ انقلابی حکومتیں سرمایہ دارانہ روحانیت کی عوامی جڑیں کمزور نہ کر سکیں۔ جب برآمداتی قیمتیں گریں، فلاحی سہولتوں میں تخفیف ناگزیر ہوئی اور عوامی حمایت مجروح ہوئی تو ان نظاموں کی عوامی بنیادیں کمزور ہوئیں۔ ان ممالک نے لبرل جمہوری ڈھانچہ قائم رکھا اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے اپنا رابطہ منقطع کرنے کی کوشش نہ کی، جس نے امریکا کو تخریب کاری کے بھرپور مواقع فراہم کیے۔ لاطینی امریکی تجربہ ثابت کرتا ہے کہ سامراج کو شکست دینے کے لیے ایک غیر سرمایہ دارانہ

معاشرت و معیشت قائم کرنا اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے یا تو تعلقات منقطع کرنا یا انہیں غیر سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب کرنا ضروری ہے۔

دوم، امریکا اور یورپ میں چلنے والی جنگ مخالف تحریکیں: ۱۹۶۰ کی نیوکلیئر ڈس آرمامنٹ تحریک، ۱۹۷۰ کی ویتنام مخالف تحریک، ۱۹۹۰ کی جنوبی افریقی تحریک، اور آج کی فلسطین حمایتی تحریک۔ ان تحریکوں کی نظریاتی اساس عموماً انارکزم فراہم کرتا ہے، ان تحریکوں کی کوئی مربوط نظاماتی تنقید نہیں ہوتی، اور یہ سرمایہ دارانہ تحکم کو سامراجیت سے منقطع کیا جا سکنے کا دعویٰ کرتی ہیں جس کا کوئی تاریخی یا عقلی ثبوت موجود نہیں۔ اوسطاً امریکی آبادی کا صفر اعشاریہ سات فیصد ہی ان تحریکوں میں متحرک رہتا ہے۔ حالیہ فلسطینی حمایتی تحریک البتہ اس لیے مختلف ہے کہ اس کا ایک ہدف اسلام دشمنی کی مخالفت ہے، جس کی وجہ سے مغرب میں مقیم مسلمان اس سے متاثر ہو رہے ہیں، اگرچہ اس میں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ مسلم حلقوں میں انارکزم اور اشتراکی نظریات قابلِ قبول گردانے جانے لگیں۔

سوم، دستوری اسلامی جماعتیں، مثلاً، جماعتِ اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، تحریکِ لبیک وغیرہ۔ یہ اصولاً سامراج مخالف ہیں لیکن دستور کی پابندی ان کی مخالفت کو محدود کرتی ہے، کیونکہ دساتیر خود سرمایہ دارانہ تحکم کا فریم ورک ہیں۔ یہ جماعتیں سرمایہ داری کی ماہیت سے واقف نہیں اور اسے محض ایک فطری معاشی ضابطہ سمجھتی ہیں۔ یہ مسلم قوم پرستی اور سوشل ڈیموکریسی سے شدید متاثر ہیں، اور سرمایہ دارانہ نظام کے انہدام کی قائل نہیں بلکہ اسکی اسلام کاری اور جزوی اصلاح کی قائل ہیں۔ جب یہ جماعتیں حکومت بناتی ہیں تو نہ سرمایہ دارانہ تحکم معطل ہوتا ہے نہ سامراج کی گرفت کمزور پڑتی ہے۔ امام مرسی کی ۲۰۱۳ کی حکومت امریکی سامراج سے سودے بازی کرتی رہی، اور ایم ایم اے کی ۲۰۰۲ تا ۲۰۰۸ پختونخوا حکومت سرمایہ دارانہ نظمِ اقتدار میں کوئی دراڑ نہ ڈال سکی۔

چہارم، اسلامی تحریکیں: مجاہدینِ اسلام، حزب اللہ، حماس، اخوان المسلمون وغیرہ، یہ سامراج پر حقیقی معنوں میں حملہ آور ہیں، اگرچہ ان کا دائرہ کار فی الحال یمن اور ساحلی افریقہ

کے علاوہ محدود ہے۔ فرقہ واریت ان کی بڑی کمزوری رہی ہے۔ عراق اور شام میں اسی نے جہادی قوتوں کو عبرت ناک شکست دلوائی۔ لیکن الحمدللہ جہادِ فلسطین میں شیعہ (حزب اللہ، انصار اللہ) اور سنی (حماس) شانہ بشانہ برسرِپیکار رہے، جبکہ عرب ریاستیں امریکا کی کاسہ لیس بنی رہیں اور صرف اسلامی جمہوریہ ایران نے مجاہدین کی بھرپور حمایت کی۔

آج دو اسلامی ریاستیں، ایران اور افغانستان، قائم ہیں، جو عملاً و اصولاً سامراج مخالف ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ امریکا دونوں کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں واپس کھینچنے کے درپے ہے۔ اس کتاب کا بقیہ حصہ اسی حکمتِ عملی کے بیان پر مشتمل ہے جس کے ذریعے یہ اسلامی ریاستیں سامراج کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

جہادی ریاست، ویلفیئر اسٹیٹ نہیں

ایک بنیادی فرق واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اسلامی ریاست کا مقصد ویلفیئر اسٹیٹ بننا نہیں، جہاں معاشی پالیسی کا مقصد عوامی سطحِ زندگی میں مسلسل اضافہ ہو۔ اس کا مقصد جہادی ریاست بننا ہے، جہاں ہر معاشی تدبیر کو اس معیار پر جانچا جاتا ہے کہ اس کا عوام کی مذہبیت اور اخلاقیات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ پالیسیاں صبر، توکل اور انفاق کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہیں یا نہیں۔ یہی خلافتِ راشدہ کا طرزِ عمل تھا، اور ہماری تاریخ کی بیشتر اسلامی ریاستوں کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ ویلفیئر اسٹیٹ کا تصور شرعِ مطہرہ میں بالکل اجنبی ہے۔

ایران اور افغانستان کے لیے یہ ماڈل اپنانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ دونوں دارالحرب سے گھری ہوئی غیر معمولی اسلامی ریاستیں ہیں، جن پر سامراج حملہ آور ہے۔

میں اس جہادی ریاستی حکمتِ عملی کی چھ بنیادی جہتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اول، ہمہ گیر قومی منصوبہ بندی کا مارکیٹی عمل پر تسلط ضروری ہے۔ اسلامی معاشرت آج خود بخود ظہور پذیر نہیں ہو گی، کیونکہ سامراج کی سرپرستی میں سرمایہ دارانہ انفرادیت کی پرورش طویل عرصہ جاری رہی ہے۔ ریاستی نمایندگی ہر سطح (فیکٹری، بازار، تمویلی ادارہ) پر فعال ہونی چاہیے۔

دوم، عسکری شعبے کو معیشت کا مرکز بنایا جائے۔ دفاعی پیداوار کو زرعی، صنعتی اور خدمتی پیداوار سے مربوط کیا جائے تاکہ دفاعی اضافہ روزگار اور دولت میں اضافے کا ذریعہ بنے، اور ایران و افغانستان اسلحہ سازی میں باہمی تعاون کریں۔

سوم، فائنانس سے نجات اور ایک حقیقی تمویلی نظام کا قیام۔ فائنانس، یعنی سود اور سٹہ کے ذریعے دولت کی مسلسل بڑھوتری کی جستجو، سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ مخصوص ہے؛ ہماری تاریخ میں بارہ سو سال تک، بغیر کسی فائنانس کے وجود کے، قرضے لیے اور دیے جاتے رہے۔ اسلامی حکومتوں کو ایک ایسا تمویلی نظام تخلیق کرنا ہے جس میں زر کی تخلیق صرف ریاست کرے، اس کی مقدار قومی پیداوار کے تخمینوں پر مبنی ہو نہ کہ سونے یا زرِ مبادلہ کے ذخائر پر، بینکاری نظام قومیا لیا جائے اور ایک مرکزی تمویلی ادارہ مرکزی بینک کی جگہ لے، زر اور قرضہ جات کی خرید و فروخت ممنوع ہو، اور آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، ایف اے ٹی ایف، ڈبلیو آئی پی او کی رکنیت ترک کر دی جائے۔

چہارم، عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے بالکل لاتعلقی ممکن نہیں، چونکہ دونوں معیشتیں ابھی خود کفیل نہیں۔ ٹیکنالوجی اور وسائل کے حصول کے تین نسبتاً محفوظ راستے ہیں: مسلم ممالک کے مخلصینِ دین کے کاروباری نیٹ ورک، روس، بیلاروس، وینزویلا، کیوبا اور شمالی کوریا جیسی پہلے سے بلیک لسٹ شدہ ریاستوں سے تعاون، اور چین سے ٹیکنالوجی کا حصول، البتہ احتیاط کے ساتھ، کیونکہ چینی سرمایہ خود سودی نظام سے جڑا ہے اور افغانستان میں چین کے اپنے بیلٹ اینڈ روڈ عزائم موجود ہیں۔

پنجم، دونوں ممالک کو قدرتی آفات سے نمٹنے کی مربوط قومی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔

ششم، اور یہ بات میں خاص طور پر ایرانی قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جمہوری عمل کو محدود اور بالآخر معطل کرنا ہو گا۔ جمہوری عمل تاریخی طور پر سامراجی تحکم کو فروغ دینے کا ذریعہ رہا ہے۔ ایران کا اپنا پینتالیس سالہ تجربہ یہی بتاتا ہے: شرعی پابندیوں کے تحت بھی فیمنزم ایک وبا کی طرح پھیلی ہے اور انتخابی نتائج دہریہ اور سامراج نواز قوتوں کے استحکام کو ظاہر کرتے

ہیں۔ افغانستان کی اسلامی امارت نے، اس کے برعکس، کسی دستور، انتخابات یا پارلیمان کے قیام سے مکمل انکار کیا ہے، اور الحمد للہ اس کا سیاسی نظام کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ ایران کو اس سے سبق سیکھ کر اپنے رائج جمہوری نظام کو بتدریج معطل کر دینا چاہیے۔ یہ خود انقلابِ اسلامی کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔

پاکستان کا اپنا راستہ: اتحادِ مساجد

پاکستان نہ ایران ہے نہ افغانستان، اور میں نہیں سمجھتا کہ یہاں جمہوریت سے مکمل لاتعلقی فی الحال ممکن ہے۔ ہماری سامراج مخالف جدوجہد ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، اور میں اس کی ایک ممکنہ ترتیب پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پاکستان کی آبادی میں مخلصینِ دین کی ایک اقلیت موجود ہے۔ وہ مسلمان جو اپنی ذاتی زندگی میں شرعِ مطہرہ کے پابند ہیں۔ ۲۰۱۸ کے ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد تقریباً دو کروڑ، یعنی مجموعی آبادی کا تقریباً نو فیصد تھی۔ ان کی بہت بڑی اکثریت غیر منظم ہے، ان کی اسلامیت ان کی ذاتی زندگی تک محدود رہتی ہے، اور سیاسی نظام سے ان کی وابستگی بنیادی طور پر تماش بین کی ہے۔

نہ دعوتی جماعتیں، جو سیاسی عمل کو شجرِ ممنوعہ گردانتی ہیں، اور نہ سیاسی اسلامی جماعتیں، جو دستوری تناظر میں مقید رہ کر مسلم قوم پرستی اور سوشل ڈیموکریسی کی نظریاتی گرفت میں آ چکی ہیں، اس مخلصینِ دین کی اصل قوت کو منظم کر پاتی ہیں۔ یہ جماعتیں عوام سے براہِ راست تخاطب کرتی ہیں، اور چونکہ عوام خود غرض اور مطلب پرست ہیں، اس لیے یہ سرمایہ دارانہ حقوق کی سیاست پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

میری تجویز یہ ہے کہ مخلصینِ دین کو ایک غیر جمہوری ادارتی صف بندی کے ذریعے منظم کیا جائے، جس کا محور اور مرکز ملک بھر میں پھیلی ہوئی لاکھوں مساجد ہوں۔ ایک بین المسالک اتحادِ مساجد، محلہ، بازار، قصبہ، صوبہ اور وفاق کی سطح پر، دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور اہلِ حدیث مساجد و مدارس کو یکجا کرے۔ مقامی سطح پر یہ اتحاد افتاء اور قضاء کے فرائض انجام

دے، قیمتوں، بشمول کرایوں اور اسکول و اسپتال کی فیسوں کی نگرانی کرے اور محتسب کا کردار ادا کرے، حلال کاروبار اور مقامی تمویلی نظام کو فروغ دے، رد کبائر و فواحش کی روک تھام کرے، اور ائمہ مساجد کو ہر سطح پر جائز عوامی نمایندوں کے طور پر ابھرنے دے۔

البتہ پاکستان کے موجودہ حالات میں جمہوری عمل کو کلیتاً رد کرنا ممکن نہیں، لہٰذا اسلامی جماعتوں کو انتخابی عمل کو اس حقیقی غیر جمہوری کام کی حفاظت کے لیے استعمال کرنا ہی ہو گا۔ مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جمہوری عمل میں شرکت مختلف انداز میں کرنی ہو گی۔ ہم بین المسالک اتحادِ مساجد کے مشترکہ پلیٹ فارم سے انتخاب لڑیں، تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی اور تمام مسالک کے مدارس و خانقاہوں کی حمایت سمیٹیں، انتخابی مہم شعائرِ اسلامی کے فروغ اور دفاع پر مرکوز رکھیں، اور منشور میں تنفیذِ احکامِ شرع کی عملی تدبیر بیان کریں: ہماری انتخابی مہم بینکنگ کو قومیانے، سود و سٹہ کے خاتمے، قرضہ جات کی منسوخی، نہ کہ مجرد اصولی نفی پر مبنی ہو، اور ہم سوشل ڈیموکریٹ یا قوم پرستانہ آدرشوں اور نعروں سے گریز کریں۔

اسلامی جماعتوں کو ۲۰۱۸ اور ۲۰۲۴ کے انتخابات میں تقریباً ساٹھ لاکھ ووٹ، یعنی تمام ووٹوں کا تقریباً نو فیصد ووٹ، ملے۔ اگر اصلاحی حلقوں کی پشت پناہی کے ساتھ ایک حقیقی وسیع انتخابی اتحاد قائم ہو جائے، تو ان شاء اللہ ایک سے ڈیڑھ کروڑ ووٹ اور قومی اسمبلی میں پچاس کے قریب نمایندوں کا انتخاب ممکن ہیں۔ جیسا کہ ۲۰۰۲ میں متحدہ مجلسِ عمل کو پینتالیس نشستیں ملی تھیں۔ یہ نمایندے کسی ایک جماعت کے نہیں بلکہ قومی بین المسالک اتحادِ مساجد کو جوابدہ ہوں گے، اور ان کا بنیادی فریضہ اتحاد کے دائرہ اختیار کا تحفظ و توسیع، اور ہر اس حکومتی پالیسی کی مزاحمت ہو گا جو ملکی معیشت، معاشرت اور ریاست کو سامراجی نظام میں مزید ضم کرتی ہو (مثلاً آئی ایم ایف و ڈبلیو ٹی او معاہدے، سامراجی فائنانشل مارکیٹوں میں پیوستگی، اور نج کاری کی پالیسیاں وغیرہ).

اس طرح، آہستہ آہستہ، اتحادِ مساجد کا معاشرتی و سیاسی دائرہ اختیار توسیع پاتا چلا جائے گا، اور

ریاستی اقتدار سرمایہ دارانہ اداروں (عدلیہ، انتظامیہ، پولیس، مقننہ اور میڈیا) سے اسلامی معاشرتی اداروں کی طرف، جمہوری و دستوری تناظر میں رہتے ہوئے، آہستہ آہستہ منتقل ہوتا چلا جائے گا۔

پس چہ باید کرد؟

سامراج کے خلاف جدوجہد لازماً ہمہ جہتی ہو گی، بیک وقت روحانی، اخلاقی، علمیاتی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی، کسی ایک پہلو پر اکتفا کافی نہیں۔

اپنے قارئین سے دیانت داری سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جدوجہد جلد مکمل نہیں ہو گی۔ اس میں نسلیں، شاید صدیاں لگ سکتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ سامراجی نظام گہرائی تک جڑیں رکھتا ہے، عالمی سطح پر منظم ہے، اور نظریاتی طور پر ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ جو کوئی جلد فتح کا وعدہ کرے، وہ یا تو آپ کو دھوکہ دے رہا ہے یا خود فریبی میں مبتلا ہے۔

لیکن یہ نظام بحران میں بھی ہے۔ اس کے تضادات گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ مجاہدین افغانستان، فلسطین، صحارا اور صومالیہ میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔ نئی سرد جنگ تینوں سامراجی مراکز کو بیک وقت کمزور کر رہی ہے، اور ماحولیاتی بحران نظام کی مادی بنیادوں کو متزلزل کر رہا ہے۔

دھارا بدلا جا سکتا ہے، لیکن صرف ان لوگوں کے ذریعے جو جانتے ہیں کہ وہ کس کے خلاف لڑ رہے ہیں، اور کیوں۔

یہ کتاب اسی فہم کی فراہمی کی ایک کوشش ہے۔ آگے جو کچھ آتا ہے، سامراجی معیشت، فائنانشل نظام، رسدی زنجیروں اور امریکا و چین کی حکمتِ عملیوں کا تفصیلی تجزیہ، اور ایران، افغانستان اور پاکستان کے لیے یہاں مختصراً بیان کی گئی حکمتِ عملیوں کی مکمل تفصیل، اسی جذبے کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اللہ اسے نفع بخش بنائے۔